پس نوآبادیاتی تنقید اور فرانز زفینن

محمد امان اللہ خان

ریسرچ اسکالر، پی ایچ ڈی اردو،

وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس وٹیکنالوجی

اسلام آباد، پاکستان

khan.maliklalian@gmail.com

Post- Colonial Theory , Criticism and Frantz Fenon

Abstract:

Colonialism is strictly referred to the policies and Methods by an Imperial Power maintained and extended its control over the territories or People. A policy of extending a Country's Power and influence through diplomacy or military. It also affects the literature of the Subject Country which is controlled by the colonialist. The Policy or practice of acquiring full or partial Political control over another country, occupying it with settlers and exploiting it economically. Frantz

Fanon has discussed much about the relationship between Colonial system and the people who have been the victim of this rude system of rul upon the innocent people . He has passed much time to examine the rule of British Government and feel much trouble of thinking due to Colonial system upon the people of Africa, Hindustan. His Books: Black Skin and white Masks, A dying Colonialism and the wretched of the Earth are most important to understand the theory of Post Colonialism and its impacts on people of Africa and Asia. One of his books is translated in Urdu with name of افتادگانِ خاک By Sajad Baqar Rizvi in Pakistan. He Clearly gives the showing glance of Colonial System and Colonialized Areas and People of Colony. This Article presents a brief history of Post - Colonial Studies of Frantz Fenon and theory of post - Colonial and its impacts on criticism especially in Urdu and other languages of oriential people, we can study and see in all over the world about the impact of this theory.This Article also Present an analysis of Colonial system and its impact on Urdu Criticism.

Key Words:

Edword Said, Frantz Fenon, Orientalism, Behaviour, Covsumer's Values, Exploitative

ایڈورڈسعید، فرانزفینن، شرق سناشی، صارفی اقدار، استحصالی رویے

جب کوئی ریاست اپنی طاقت کے بل بوتے پر کسی کم زور ریاست کے علاقے اور لوگوں کو اپنی عمل داری میں لے کر مقبوضہ ریاست کے قدرتی وسائل اور وہاں کے افرادی قوت کو اپنے اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے فروغ کے لیے استعمال کرے تو مغلوب ریاست غالب ریاست کی نو آبادی کہلاتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں طاقت ور ریاست اور قوم کسی کم زور ریاست اور قوم کو اپنے مفاد کی خاطر اپنے قبضے میں لے لیتی ہے۔ قابض ریاست کا غلبہ مقبوضہ ریاست کے تمام تر قدرتی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی وسائل کے ساتھ ساتھ افرادی قوت اور تجارتی منڈیوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی غلبہ کی بنا پر قابض ریاست اپنی اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی کو فروغ دیتی ہے۔ نہ صرف اقتصادی و معاشرتی شعبے بل کہ حکومتی انتظام چلانے والے تمام ادارے بھی قابض ریاست کے دائرہ اختیار میں آجاتے ہیں۔ یوں قابض ریاست اپنی اس نو آبادی پر مکمل اختیار حاصل کر لیتی ہے۔ مزید یہ کہ اس اختیار کو برقرار رکھنے کے لیے فوجی طاقت کا بھی بھرپور استعمال کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ قابض ریاست اپنی نو آبادی کے مقابلے میں معاشی، معاشرتی، اقتصادی مجموعی اعتبار سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حربی اور سائنسی حوالے سے بھی فوقیت رکھتی ہے۔ قابض ریاست اپنی اسی برتری کی بنا پر خود کو مقبوضہ قوم کے مقابلے میں ایک بہتر قوم اور نسل شمار کرتی ہے اور یہی احساسِ تفاخر ہی غالب قوم کے عزائم کو مزید تقویت دینے کے ساتھ مہمیز بھی دیتا ہے اور وہ دوسری اقوام کو اپنے زیر نگیں کرنے اور ان کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کو اپنا حق سمجھنے کا احساس پیدا کرتا ہے۔

نوآبادیاتی نظام ایک اصطلاح ہے جو یورپی اقوام کی دیگر کم زور اقوام پر سیاسی گرفت

اوران کے وسائل پر قابض ہونے کے طریقہ کار کے لیے مستعمل ہے۔ یورپی نوآبادیاتی نظام نے باقاعدہ طور پر سولہویں صدی عیسوی میں اپنا وجود قائم کرنا شروع کیا اور اٹھارویں صدی عیسوی تک اس استعماری نظام نے تشکیل پا کر اپنی جڑیں مضبوط کیں، جب کہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں برطانوی قوم نے دنیا کی مختلف کم زور اقوام کو اپنے تسلط میں لے کر نہ صرف اپنی نوآبادیاں بنایا بلکہ ایک مربوط اور منظّم نوآبادیاتی نظام کی بنیاد رکھ کر دنیا کے تقریباً پچیس فی صد حصہ کو اپنے زیرنگیں کرلیا۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنے مضمون "امپیریئل ازم کیا ہے" میں اس کو کچھ ان الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی اس نظام کے حوصلے مزید بلند ہوئیاور اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ تجارتی مسابقت اور نئی منڈیوں کی تلاش برطانیہ، ہالینڈ، پرتگال اور اسپین کو امریکہ، ایشیا، افریقہ، اور آسٹریلیا کے بیشتر حصوں میں لے گئی جہاں ان قابض ممالک نے اپنی اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ انیسویں صدی میں روس، اٹلی، جرمنی اور خود امریکہ بھی ان استعماری ممالک کی صف میں شامل ہوئے''۔(۱)

اردو انگلش ڈکشنری کے مطابق لفظ Colonialism کے مفاہیم کچھ یوں ہیں:

> "The Policy or practice of aquiring full or partia political control over another country, occupying it with swttlwrs and exploting it economically." (2)

ترجمہ: کسی بھی ملک پر کسی دوسرے طاقتور ملک کا سیاسی طرز کا کنٹرول (چاہے وہ جزوی ہو یا مکمل) نوآبادیاتی نظام کہلاتا ہے جو کہ آبادکار کو معاشی و اقتصادی فائدہ دیتا ہے، اگرچہ اس مقبوضہ ریاست

کا استحصال ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح جب لفظ سامراج یا امپرئیل ازم کو دیکھا گیا تو اس کے مفاہیم کی فہرست میں ذیل کا مفہوم پایا گیا:

"A policy of extending a country's power and Influence through diplomacy or military."(3)

ترجمہ: کسی ملک کا فوجی طاقت یا سفارت کاری کے بل بوتے پر کسی دوسرے ملک پر حکومت کرنا سامراج یا شہنشاہیت کہلاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس عمل میں اپنی طاقت کا لوہا منوانے کے لیے فوجی طاقت کے استعمال کو ہمیشہ فروغ دیا جاتا رہا ہے۔ عالمی جنگیں اس بات کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

فیروز اللغات کے مطابق سامراج **''نوآبادیات اور ماتحت سلطنتیں رکھنے کی پالیسی" (۴)** ہے۔ اسی طرح نوآبادی **"نیا آباد کیا ہوا علاقہ، کالونی، مقبوضہ علاقہ'' (۵)** ہے۔ نوآبادیات کا لفظ نوآبادی کا اسم جمع ہے جس کے لغوی معنی نئی آبادی یا نئی کالونی۔ کالونی کا لفظ بنیادی طور پر لاطینی اصطلاح Colonia سے نکلا ہے جس کے مفہوم میں کچھ منظّم افراد کا کسی دوسری انسانی آبادی کو یرغمال بنا کر اس کے استحصال کے لیے اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا شامل ہے۔ اسی وجہ سے یہ لفظ ایک خاص سماجی حالت کا ترجمان ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اس لفظ کی معنوی حدود کا تعین کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں **''یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں برپا ہونے والی صورتِ حال ہے'' (۶)** یہ صورتِ حال پیدا کرنے والے افراد نوآبادکار کہلاتے ہیں۔ ڈکشنری آف پالیٹکس کے مطابق نوآبادیات (Colonialism) کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"Colonialism: Stricty referred to the politics and methods by an imperial power

maintained and extended its control over other terrotories or people, Now more frequently used in a pejorative sense. Often synonymous with imperialism." (7)

فرہنگ اصطلاحات میں اس کے معانی **"استعمار پسندی اور استعماریت"** (۸) بیان ہوئے ہیں۔تاریخ بتاتی ہے کہ نوآبادیات کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے روم کے لوگوں نے کیا۔وہ جب بھی کسی علاقے کو فتح کرتے تو اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے مفتوحہ علاقوں میں اپنی قوم کے افراد پر مشتمل گروہ وہاں بسا دیتے تھے۔اس جدید دور میں یہ اصطلاح غیر ملکی تسلط اور قبضے کے لیے مستعمل ہے۔یورپی اقوام نے جب امریکہ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ پر اپنا قبضہ پکا کر لیا تو یورپی اقوام نے رومی لوگوں کی طرح اپنی اقوام کو یہاں نہیں بسایا بلکہ مقامی آبادی کے چند افراد کی مدد سے انتظام وانصرام قائم رکھا۔اس کی واضح مثال ہندوستان میں دیکھی جاسکتی ہے جہاں پر صرف چالیس (۴۰) ہزار یورپی افراد نے مقامی افراد پر مشتمل دو لاکھ افراد کی فوج بنا کر بیس (۲۰) کڑور افراد کو اپنا غلام بنائے رکھا۔نوآبادیاتی تصور کو دو بنیادوں پر پیش کیا گیا۔وہ دونوں تصورات یہ تھے:

۱۔ ہم بہتر قوم ہیں لہٰذا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

۲۔ ہم مہذب اور ترقی یافتہ ہیں اس لیے غلاموں کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔ (۹)

جیسا کہ Kipling نے اپنی مشہور نظم Burden White Man's میں بھی اس کا واضح اظہار کرتا ہے۔

پس نوآبادیاتی مطالعہ میں جن سیاسی و سماجی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی، علمی و ادبی مباحث کو مرکزی دھارے میں لایا گیا ان میں عالم گیر حربے، صارفی اقدار، اقوام کی ذلت، نسوانی طبقات اور سامراجی طرز حکومت کے سبب نوآبادیاتی ثقافتوں میں پیدا ابھرنے والے تغیر وتبدل،

اس کی نشو ونما اور ارتقاء کے مخصوص زاویوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔اس قسم کے مطالعہ کی نظریاتی بنیادوں پر مشرق ومغرب کے چند اہم دانش وروں نے قلم اٹھایا ہے۔اس ضمن میں ایڈورڈ سعید (۱۹۳۶ء-۲۰۰۳ء) کی کتاب "شرق شناسی" (Orientalism) اہم ترین کاوش ہے۔ اس کتاب میں ایڈورڈ سعید نے اسلامی دنیا کے بارے مغربی طرز فکر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ خاص طور پر مظلومین کے حق میں انتہائی مضبوط دلائل سے بات کی ہے مغربی اقوام کی مشرقی اقوام پر بالادستی، مزاحمت کاری، عمل داری، مغربی اقوام کی نسل پرستی، بیانیے اور بطور خاص مشرقی اقوام کی تاریخ مسخ کرنے جیسی پالیسیوں پر اپنے علمی بساط کے مطابق خوب بحث کی ہے۔ایڈورڈ سعید نے اپنی کئی دیگر کتب میں پس نوآبادیاتی بیانیے کی وضاحت کی ہے اس کی اہم ترین کتب ہیں۔

1. The Question of Palestine
2. Covering Islam
3. After the last sky
4. Blaming the victims
5. Culture and Imperialism
6. Literature and Society
7. The Pen and the Sword
8. The world the text the critic

After the اور the Question of Palestine، Covering Islam Last sky ان تینوں کتب میں عرب دنیا خاص فلسطینی عوام کے مسائل کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ایڈورڈ سعید کے فکری نظام میں جن دیگر شخصیت کا عکس ملتا ہے اس میں جوزف کونارڈ کی فکر واضح نظر آتی ہے جوزف کونارڈ خود بھی مغربی سامراجیت کا انتہائی مخالف تھا۔ایڈورڈ سعید عربی، فارسی اور انگریزی ادبیات پر مہارت نامہ رکھتا تھا۔اسی لیے انھوں نے ان زبانوں کے علمی اور ادبی

مباحثوں اور ذخیروں کا بہ خوبی جائزہ لیا اور ان میں در آنے والے استعماری واستحصالی رویوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔ انگریزی زبان و ادب پر کڑی تنقید کرتے ہوئے معروف ناول نگار Jane Auston کے ناول Pride and Prejudice کو اپنے نشانے پر لیا۔ اسی طرح ردیاڈ کپلنگ کے نام "Kim" کے ساتھ دیگر افسانوی تحریروں کو بھی سامراجی استعمار کی کڑیاں قرار دیا۔ تہذیب وتمدن کی بنیادی قدروں اور ان قدروں پر سامراجی اثرات کے جائزہ کے لیے ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "ثقافت اور سامراج" Culture and Imperialism لکھ ڈالی۔ اس کتاب میں مختلف زبانوں کے ادبی متون کو بطور سند کے پیش کیا ہے۔ ایڈورڈ سعید کی ناقدانہ رائے میں سیاسی فکر و فلسفے، معاصر حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ تہذیب کے سماجی و ثقافتی رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ایڈورڈ سعید کے ان تجزیات کو گزشتہ دو سے اڑھائی سو سال کے سامراجی واستعماری نظاموں کے حوالہ سے لاجواب سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مطابق نوآبادیات کے مقتدر طاقتیں اپنی محکوم آبادیوں کو بے بس، لاچار اور کم زور بنانے کے لیے ان کی معاشرتی، ثقافتی، تاریخی، لسانی علمی، عملی، سماجی اور سیاسی قدردوں سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرتی ہیں اور یہی واقفیت ان کے لیے طاقت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ معروف ومشہور فلسفی اور مفکر نطشے کا نظریہ علم "Knowledge is Power" کو نوآبادکاروں کے نوآبادیاتی نظام کا لازمی حصہ سمجھا گیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اس فلسفے کے انقلاب پرور تصور کو ''Knowledge is colonialism'' میں استعمال کر کے استعماری وسامراجی نظام کے استحصالی رویوں اور حکمت عملیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کے خیال میں نوآبادیاتی نظام ایک مدغم دنیا ہے جس میں دنیا کے مختلف علاقوں کے ثقافتی وسیاسی، سماجی ومعاشی، معاشرتی اقتصادی قدریں اور رویے باہم مل کر نئے نئے معاشرتی رویے تخلیق کر رہی ہیں اور یہ سلسلہ آہستہ آہستہ باقاعدہ ایک عالم گیر نظام کی طرف جاتا محسوس ہو رہا ہے اس عالم گیر سلسلہ کو قائم کرنے کے لیے کئی قوتیں متحرک ہو کر اجتماعیت کا سامان کر رہی ہیں:

' 'عالم گیریت کا تصور سب سے پہلے میکلوہن (Maclauhan)نے۱۹۶۸ء میں The Global Village کی اصطلاح استعمال کر کے علمی دنیا میں متعارف کرایا"۔(۱۰)

ایڈورڈ سعید یورپی سامراجیت کے دور پر بحث کرتے ہوئے اپنے مؤقف میں بیان کرتے ہیں کہ یورپی مغربی استعمار اور سامراجیت کی شروعات انیسویں صدی کے صنفی عہد سے ہوتیں ہیں۔اس کے مرکزی کردار فرانس اور برطانیہ تھے۔ان قوتوں نے اپنے مقتدر بیانیے کے زور پر اپنے سے کم تر اور کم زور اقوام پر غلبہ حاصل کر کے ان کے زمینی، زرعی، معاشی، اقتصادی وسائل پر قبضہ کیا اور ان وسائل سے حاصل ہونے والے خام مال کے ساتھ ساتھ افرادی قوت بھی حاصل کی اور اپنی معاشی بنیادوں کو مضبوط تر بنایا۔محکوم طبقہ علمی سرپرستی اور تہذیبی ترقی کے نام پر بھی ان سامراجی اور استعماری طاقتوں کے سبب استحصال کا شکار ہوا۔اس استحصال نے دیگر معاصر تاریخی بیانیے کی معروضیت کو بے دردی سے پامال کیا اور اس کو مسخ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی بیسویں صدی میں طاقت کے نشے سے بھرپور ان سامراجی طاقتوں نے پوری دنیا کو اپنے ماتحت کرنے کے خواب دیکھے اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے طاقت کا اندھا دھند استعمال کیا نتیجہ یہ نکلا کہ عالم گیر جنگوں کے سبب سامراجی اور یہ استعماری نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا اور بیسویں صدی کے آخری ربع تک تمام نو آبادیاتی آبادیاں اور محکوم اقوام آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ البتہ سرد جنگ میں مشترکہ طاقتوں کے ناکام ہونے پر تیسری دنیا ایک نئی قسم کی نو آبادیاتی صورت حال سے دوچار ہوگئی ہے۔اسی نئی نو آبادیاتی دنیا اور نئے نظام میں امریکہ کو یک قطبی قیادت بن کر ابھرا۔موجودہ دور میں نئے نو آبادیاتی، سامراجی اور استعماری نظام کے استحصالی اثرات پہلے نو آبادیاتی نظام سے کہیں زیادہ خطرناک اور تشویش ناک صورت حال اختیار کر چکے ہیں جس کی زندہ مثال افغانستان، عراق، شام، فلسطین، کشمیر، یمن اور برما جیسے

علاقوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ایڈورڈ سعید نے فلسطینی عوام کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے حق گوئی کا ساتھ دیا اور اپنے ہی ملک کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ 1980ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب "Covering Islam" میں انہوں نے مسلمانوں کی مظلومیت کا مقدمہ بڑی جرأت مندی سے لڑا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مغربی مفکرین، فلاسفروں اور دانش وروں کی طرف سے اسلام کی مسخ کر کے پیش کرنے پر سخت تنقید کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت کی طرف سے شروع کیے گئے نئے نو آبادیاتی، سامراجی اور استعماری ایجنڈے کا پردہ چاک کرتے ہوئے اس کی استحصالی کارروائیوں کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ مزید براں یہ کہ اسی فکری وتنقیدی تناظر میں ۹/۱۱ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر حملوں کو بھی امریکہ اور اسرائیل کی ذاتی منصوبہ بندی اور استعماری کارروائیوں کا شاخسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

پس نو آبادیات مطالعہ دنیا کے اکثر علاقوں میں واقع ہونے والی نو آبادیاتی صورت حال اور اس سے قائم ہونے والے سماجی، سیاسی، ثقافتی، علمی وادبی رشتوں کو واضح کرتا ہے یہ رشتے عموماً نو آبادکار قوتوں اور ان کی محکومین کے مابین قابض اور مقبوض ہونے کے ناطے کو واضح کرتے ہیں۔ نو آبادکار اور نو آبادی کے باشندوں کے مابین مزاحمت اور مفاہمت کی اکثر صورت ان مخصوص مفادات کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کے سبب نو آبادکار ان مقامی آبادیوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہوتا ہے۔ نو آبادکار اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے ایسے بیانیے تشکیل دیتا ہے جو ان کے ان آبادیوں پر کنٹرول اور قیام کا جواز فراہم کرتے ہیں یہی بیانیہ اکثر و بیشتر ایک خوف کی طرح مقامی آبادیوں کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں جن کے اثرات سے باہر آنے کے لیے مقامی باشندوں کو صدیوں پر محیط سفر طے کرنا پڑتا ہے اور اس سارے سفر میں نسلوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ پس نو آبادیاتی مطالعہ، نو آبادیاتی دور میں تشکیل پانے والے ایسے ہی بیانوں کو دنیا کے سامنے لانے کی کاوش ہوتی ہے۔ سیاسی، علمی و ادبی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، معاشی، ثقافتی، سائنسی سطح پر

سرایت کر جانے والی بہت ساری تبدیلیاں، جن کا اکثر نو آبادکار مقامی باشندوں کے لیے انقلاب کی راہ قرار دے چکا ہوتا ہے اور ان کے ترقی کے سہانے خواب دکھا چکا ہوتا ہے۔ دراصل اپنی طاقت اور اقتدار کو مضبوط کرنے اور برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں اردو زبان وادب میں پس نو آبادیاتی مطالعہ کے آغاز کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس حوالہ سے جو تحریریں منظر عام پر آئیں ہیں ان میں ایڈورڈ سعید کی کتب شرق شناسی، ثقافت اور سامراج، Covering Islam کو اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

فرانز فینن پس نو آبادیاتی مطالعہ کے پہلے پہلے مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جو فکری نظریات وتصورات انھوں نے پیش کیے ہیں اردو ادب ان پر کم توجہ کی گئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند پر انگریز سامراج کے دور میں تخلیق ہونے والے ادبی متون کو فینن کے نظریاتی تناظر میں انگریزی نو آبادیاتی نظام کو با آسانی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ طاقت کے وہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی مظاہر کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی متون جن کے ذریعے ان نو آبادکاروں نے صوبوں میں رائج نظام حکومت، رسوم اور رواج، اقدار و روایات اور زبان وادب کو اچھی طرح پرکھا جا سکتا ہے، فرانز فینن نے نو آبادیاتی دور کی صورت حال کے زمرے میں جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے ان میں خاص اقتصادی اور معاشی صورت حال کو معاشی و اقتصادی سطح پر کم زور قوموں اور طاقت ور اور زور آور قوموں کے مابین موجود باہمی کش مکش سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ تمام اقوام و ممالک جو کبھی کسی نہ کسی صورت میں نو آبادیاتی، سامراجی یا استعمارات کا حصہ رہے ہیں، آج بھی نفسیاتی، معاشی، اقتصادی طور پر مکمل آزادانہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نو آبادیاتی دور کے قائم کردہ بیانیے نے اپنے اثرات اتنے پختہ انداز میں ثبت کیے ہیں کہ آج بھی نو آبادیاتی دور کی محکوم اقوام بالواسطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی محسوس ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں نو آبادیاتی غلامی سے آزادی حاصل کرنے والے دونوں ممالک ہندوستان اور پاکستان بہ طور مثال ہیں۔

نو آبادیاتی دور کی غلامی سے نجات حاصل کیے ستر سال سے زائد عرصہ بیت چکا ہے لیکن

پھر بھی نو آبادیاتی دور کی تہذیب وثقافت، زبان، لباس، قانون، آئین علمی وادبی نظریات، تعلیمی پالیسیاں جوں کی توں ہیں۔فرانز فینن کے فکری نظریات سے صرف افریقی نوآبادیاتی آبادی کی ہی نشان دہی نہیں ہوتی بل کہ سامراجی نظام کے مدمقابل مزاحمتی بیانیے بھی سامنے آتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں قائم نوآبادیاتی نظام میں فینن کی فکر اسی لیے حقیقت کے زیادہ قریب ہے کہ اس میں ان درجات کو بہ آسانی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جن کو طے کرنے کے بعد محکوم طبقات کے افراد غلامی کی زنجیروں کو اتار پھینکنے میں کامیاب ہوئے۔اس کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی دور کے ان کرداروں کا بھی اصل چہرہ سامنے آجاتا ہے جو دراصل مقامی آبادی کو آزادی دلانے کی آڑ میں اپنے اپنے ذاتی مفادات کی جنگ لڑتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قوم میں منافقانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے۔

فرانز فینن کی پہلی کتاب ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئی جس کا نام Peau Noire Masques Blancs ہے۔اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ Black skin white masks کے نام سے کیا گیا۔ یہ کتاب افریقی نسل کے محکوم باشندوں کی نفسیات پر نوآبادکاروں کی طرف سے مرتب ہونے والے منفی اثرات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔اس کتاب میں افریقی باشندوں کے نفسیاتی جائزوں کو سامنے رکھتے ہوئے سامراج کی کھینچی گئی ان لکیروں کا واضح عکس دیکھا جاسکتا ہے جن کے تحت مغلوب ومحکوم اور مظلوم باشندے ذہنی، نفسیاتی اور روحانی اذیتوں کا شکار ہوجاتے ہیں دراصل یہ کتاب فرانز فینن کے ان تجزبات کی یادگار ہے جو انھوں نے الجیریا کے ایک ہسپتال میں سامراجی واستعماری ظلم وتشدد کا نشانہ بننے والے مظلوم افراد کے نفسیاتی معالج کے طور پر کیے۔ واضح رہے کہ الجیریا کو فرانسیسی استعمار کاروں نے اپنی استعماریت اور نوآبادیت کے نظام میں عرصہ دراز تک محکوم ومغلوب بنائے رکھا۔ایک نفسیاتی معالج ہونے کے ناطے فینن نے اپنی تہذیب وثقافت کے حوالہ سے ایک نبض شناس کے طور پر کام کیا یہی وجہ ہے کہ فینن کے نوآبادیاتی مطالعات میں اولین مقام حاصل ہے۔فینن کے خیال میں سامراجی اور نوآبادیاتی

قوتوں کی طرف سے متعارف کرائے بیانیے مقامی باشندوں کی سیاسی وثقافتی، تہذیبی وتمدنی، علمی وفکری، ادبی وتخلیقی، سماجی ومعاشرتی، معاشی واقتصادی رویوں کواس طرح رونڈ ڈالتے ہیں کہ مقامی آبادی کا ہر فرد ایک وجودی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور احساس کم تری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نوآبادکار کی طرف سے مقرر کردہ یہ نسلی شناخت جو مقامی باشندوں جو جہاں احساس کم تری میں مبتلا کرتی ہے وہاں ان مقامی باشندوں کو خود کو ذات کی از سرنو دریافت کے لیے سوچ اور فکر مہیا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ افریقی مقامی باشندے خود کے چہرے پر ایسا ماسک / خول چڑھانے پر مجبور ہوئے جس کے سبب وہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، علمی، فکری اور معاشی سطح کی ترقی کے لیے اپنے نوآبادکاروں کے قریب ہوئے۔ برصغیر پاک وہند بھی نوآبادیاتی دور میں اپنے نوآبادکاروں اور مقامی باشندوں کے درمیان اس قسم کی مقبولیت اور مزاحمت کے عمل سے گزر چکا ہے اور نوآبادیاتی دور کی ایسی کارگزاریاں ہرگز ڈھکی چھپی نہ ہیں۔ فینن نے افریقی باشندوں کے لیے نسلی بنیادوں پر نیگرو (Negro) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جو دراصل ایک تخصیص ہے کہ اس سرزمین پر باقی ماندہ افراد کو نوآبادکار نے اپنی من مانی کی شناخت مہیا کی ہے۔ فینن اس پیچیدہ نوآبادیاتی حربے سے بچنے کے لیے مقامی باشندوں کو اپنی مقامی ثقافت سے جڑے رہنے اور اسی پر قائم رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کے خیال یہی وہ عمل ہے کہ جس کے سبب مقامی باشندے نوآبادکاروں کے غالب آنے والے تہذیبی وثقافتی حربوں اور نسلی تفاخر ومنافرت کے مدمقابل کوئی مزاحمتی بیانیہ پیش کر سکتے تھے۔

فینن کی دوسری کتاب A Colonialism Dying (Ancique L') میں مقامی باشندوں اور حاکم نوآبادکاروں کے درمیان باہمی کش مکش کو بیان کیا گیا ہے۔ مزید برآں ان مدارج کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کو طے کر لینے کے بعد کوئی بھی قوم کسی سامراج کی غلامی کی زنجیروں سے آزادی حاصل کر لیتی ہے اس کتاب کا بنیادی موضوع فرانسیسی نوآبادکاروں اور الجیریا کی مقامی آبادی کے باشندوں کے درمیان جاری کش مکش کا بیانیہ ہے جس نے بکھرے ہوئے

مقامی افراد کو نو آبادکاروں کے ظلم و تشدد کے خلاف اکٹھا ہونے اور مزاحمتی تدبیروں کا سامان کیا ہے۔فینن کے نزدیک جب مقامی باشندے ہر قسم کی طبقاتی تقسیم سے صرف نظر کرتے ہوئے آزادی کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ان کے سامنے ظالم، جابر اور متشدد حکمرانوں کی حیثیت "کائی" کی سی ہوتی ہے۔اس اجتماعیت کے ساتھ ساتھ مختلف ذرائع ابلاغ بھی استعمار کار کے ظلم و تشدد اور جبر کے خلاف شعور اجاگر کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ایسے میں یہ ذرائع ابلاغ برقی رو کا کردار ادا کرتے ہوئے مقامی افراد میں بجلیاں پیدا کرنے کا بھی سبب بنتے ہیں۔فینن کے مطابق یہ دونوں ذرائع ابلاغ نو آبادکاروں کے ظلم و استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے آزادی کی جنگ میں مقامی مجاہدین آزادی کی آواز بن کر ان کی پکار کو دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ ہندوستان کی صورت حال کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا جائے تو ہندوستان کے نو آبادیاتی دور میں بھی اخبارات، رسائل، جرائد اور مقامی باشندوں کے جلسے جلوس اور ان میں پیش کردہ مزاحمتی بیانیے اور اس بیانیے کے عوض اپنی طلب نے آزادی کی راہ ہموار کرنے میں اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے۔زمیندار، چٹان، اودھ پنچ اور ہلال جیسے رسائل و جرائد نے برطانوی نو آبادکاروں کے خلاف مزاحمت اور ان کے خلاف رائے عامہ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ انگریز سامراج کی طرف سے مختلف پابندیوں، سزاؤں اور جرمانوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔فینن کے خیال میں جہاں یہ ذرائع ابلاغ مقامی افراد کے مرد حضرات میں جذبہ حریت پیدا کرتے ہیں وہاں یہ ذرائع ابلاغ مقامی عورتوں کو بھی تحریک آزادی میں شامل ہونے کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ان ذرائع ابلاغ کی چھان پھٹک سے جب تحاریک آزادی کی مرقوم داستانیں عام لوگوں کی دسترس میں آئیں تو وہ لوگ جو ان نو آبادیاتی نظام کے استحصال کے خلاف صف آراء ہوئے تھے عوام کی نظر میں قومی ہیرو ٹھہرے۔فینن نے یہ بھی واضح کیا کہ تحریک آزادی کی جدوجہد میں نو آبادکاروں کی طرف سے متعارف کیا جانے والے بیانیہ بالآخر معدوم ہو جاتا ہے جن کا مقصد مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینا اور مقامی باشندوں کو ان کی مقامی روایات اور رسوم و رواج سے محروم کرنا ہوتا

ہے۔مقامی باشندوں کی تہذیب وثقافت نوآبادکاروں کی طرف سے تھوپی گئی تہذیب وثقافت کے سامنے اپنی مزاحمت جاری رکھتی ہے اور آخر کار سامراجی اور نوآبادیاتی تہذیب وثقافت کو جزوی یا مکمل بے دخل کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتی ہے۔فینن کے الفاظ میں:

> ''کسی بھی تہذیب کے بعض ستون انتہائی طاقت ور ہوتے ہیں جن کے سہارے وہ کھڑی ہوتی ہیں، انہیں اس قدر آسانی کے ساتھ نہیں ہلایا جاسکتا۔جب کہ استعمار نواز حلقوں کو مبالغہ آرائی کی حد تک اپنی کامیابی کی توقع ہوتی ہے''۔(۱۱)

فینن نے اپنی اس دوسری کتاب میں تحریک آزادی کے دوران پیش آنے والی لسانی صورت حال پر دل کھول کر گفتگو کی ہے اس کی تحقیق کے مطابق سامراجی قوتوں کی متعارف کردہ زبان جو کہ مقامی باشندوں کے لیے ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت میں ہوتی ہے، بالآخر آزادی کے لیے ایک ذریعہ بن جاتی ہے اور ایک آلہ کا کام دیتی ہے۔مقامی لوگ جب بدیسی زبان سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں تو بین الاقوامی سطح پر اپنا پیغام پہنچانے کے لیے اسی بدیسی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور یہی حکمران زبان ان کے لیے ایک ہتھیار بن جاتی ہے۔اسی بدیسی زبان کو استعمال کرتے ہوئے سامراجی استحصال اور ظلم وستم کے خلاف ملکی و غیر ملکی اخلاقی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز سامراج کے آجانے سے مقامی آبادی نہ صرف انگریز سے نفرت کرتی تھی بل کہ ان کی زبان سے نفرت کرتی ہے اور اس کو ناپسند کرتی ہے۔ابتدائی طور پر برصغیر پاک و ہند میں بھی مقامی باشندوں نے انگریزی زبان سے اس حد تک احتراز کیا کہ مقامی علماء کرام نے انگریزی زبان کے سیکھنے کو کفر قرار دے دیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کے افراد نے استعمارات کے استحصالی ہتھ کنڈوں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے نہ صرف انگریزی کو سہارا بنایا بل کہ اسی زبان کی وساطت سے اپنے مسائل دنیا کے سامنے رکھے جس سے ان کے سیاسی وملی شعور میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔یہی ایک

بنیادی سبب تھا جس نے ہندوستان کے باشندوں کو انگریز سرکار کے خلاف اکٹھا ہونے پر مجبور کیا اور انھوں نے اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے "اے ہیوم" نامی شخص کی سرپرستی میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں رکھی۔ اسی پلیٹ فارم نے ہندوستان کے لوگوں میں حقیقی رد استعمارات پیدا کیا گیا اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ہندوستان میں جہاں انڈین نیشنل کانگریس کا وجود آیا وہاں مسلم لیگ کا قیام بھی اسی سلسلے کی کڑی ثابت ہوا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں قائم ہونے والی سیاسی جماعت مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن کر ابھری۔ یوں کانگریس اور مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں کے قیام سے مقامی آبادی کی اجتماعیت نے نو آبادکاروں کے عزائم کو خاک میں ملانا شروع کیا اور آزادی اور انقلاب کے نعروں کی گونج بین الاقوامی ایوانوں تک پہنچی۔ نوجوان قیادت یورپ کے بڑے بڑے تعلیمی اداروں سے تعلیم مکمل کر کے لوٹی تو اسی استعماری زبان کو بہ طور ہتھیار استعمال کیا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ زبان و ادب نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔

فینن کی مشہور کتاب The Wretched of the Earth کا ترجمہ سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز نے کیا۔ فینن کی اس کتاب نے علمی دنیا میں استعماریت اور سامراجیت کا اصل چہرہ بے نقاب کیا۔ اس کتاب میں فینن نے یہ نظریہ دیا ہے کہ نو آبادیاتی دنیا ثنویت کے تصور پر قائم ہے اور اس نظام میں سارا زور اسی بات پر ہے کہ ایک خاص نسل، رنگ، ملک، علاقے اور مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو دنیاوی وسائل پر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پورا حق ہے جب کہ ان کے برعکس کسی دوسری نسل، علاقے، رنگ اور مذہب کے افراد ان کے ماتحت ہیں فینن نو آبادیاتی صورت حال کو ایک قسم کی اقتصادی صورت حال سے تشبیہ دیتا ہے۔ فینن کے مطابق:

> ''نو آبادیاتی صورت حال کی اصل جدت وہ اقتصادی حقیقت ہے جس میں اتنی شدید معاشی ناہمواری اور طرز زندگی کا اتنا بڑا فرق ہوتا ہے کہ انسانی صورت حال کی اس قدر پردہ پوشی کسی اور طریقے سے کبھی نہیں ہوتی

.....نوآبادیات میں اقتصادیات کا زیریں نظام بھی ایک بالائی نظام ہوتا
ہے۔سبب ہی نتیجہ ہوتا ہے۔آپ دولت مند ہیں اس لیے آپ سفید فام
ہیں،آپ سفید فام ہے اس لیے کہ آپ دولت مند ہیں''۔(۱۲)

فرانز فینن کے درج بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوآبادیوں کے مقیم باشندے نوآبادکاروں کی طرف سے مسلسل استحصال کا شکار ہو کر بالآخر ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔یہ احساس کمتری صرف اسی صورت میں ختم ہوسکتا ہے جب انسان کو شرف آدمیت برابری کی سطح پر ہو۔اسی بنا پر نوآبادکار اپنا نظام ثنویت کے تصور پر قائم کرتا ہے تا کہ اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکے۔ پہلے پہل مفاہمتی پالیسیوں کے مطابق مقامی، باشندوں کے دل میں احسان اور شکر گزاری کے جذبات اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بعدازاں استعمار کار اپنی چالاکیوں اور منافقانہ چالوں کے ذریعے اپنے اور مقامی باشندوں کے درمیان موجود تہذیبی و ثقافتی، علمی و ادبی، سیاسی و سماجی اور علمی و فکری بُعد پیدا کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے یوں وہ مقامی آبادی اور خود کے درمیان دو دنیاؤں کیا یک الگ ذہنی ساخت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔خود کو اعلیٰ اور مقامی آبادیوں کو ادنیٰ تر تصور کر لیا جاتا ہے۔ فرانز فینن کے مطابق اس دنیا کی تقسیم نسلی امتیاز کی بنیاد پر ہے۔مغربی لوگوں کے ہاں مشرقی باشندوں کے لیے ایک خاص قسم کی کشش ہے وہ یہ کہ مغربی لوگ خود کو دنیا کی اعلیٰ ترین نسل اور حکمران تصور کرتے ہیں جب کہ باقی تمام دنیا کو اپنا غلام اور محکوم خیال کرتے ہیں اور ان غریب طبقوں پر حکومت کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔یہی رویے مقامی باشندوں میں ہمہ وقت ایک اعصابی او ردہنی ہیجان پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔نوآبادکاروں کو ہمیشہ اپنے ان رویوں کے سبب مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اسی مزاحمت کے سبب نوآبادکار ہمہ وقت مقامی تہذیب، ثقافت، سماج، معاشرت اور مذہب سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔یہ کشش گریز، انجذاب وانحراف، مفاہمت و مخاصمت کے دو رویہ جذبات صرف نوآبادکار اور مقامی باشندوں کی زندگیوں کو ہی نہیں بلکہ ان کے

خیالات اقدار و روایات، تحریر و تقریر اور رسوم و رواج غرض ہر چیز کو متاثر کرتے نظر آتے ہیں۔ نوآبادکاروں اور استعماری طاقتوں کی طرف سے مستعمل اصطلاحات "ہم" اور "وہ" اعصاب پر اس حد تک اثرات مرتب کرتی ہیں کہ مقامی باشندے نوآبادکاروں کے استعمار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان جیسا بننے کے خواب بھی دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

فینن نوآبادیاتی صورت حال کے سمجھنے کے لیے علمی سطح پر مقامی لوگوں کے علمی سرمائے کا تجزیہ کرنا لازمی خیال کرتا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ نوآبادیاتی صورت حال کو رد کرنے کے لیے مقامی باشندوں نے نوآبادیاتی بیانیے کو کس طرح رد کیا یا اس کو اپنا لیا۔ وہ کون سے ذہنی عوامل تھے جنھوں نے "وہ" اور "ہم" کا فرق پیدا کیا اور اس کے لیے ذہنی فضا تیار کی۔ آخر کیوں استعمار کار اپنی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کو اعلیٰ ترین خیال کر کے اپنا فکری نظام رائج کرنا چاہتے تھے۔ وہ کون سی وجوہات تھیں جن کے تحت نوآبادکار اور اس کی تہذیب و ثقافت سے مخاصمت کی بجائے مفاہمت کی راہیں نکلتی تھیں۔ فینن کا خیال تھا کہ بعض مقامی ادیب و مفکر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استعماری سرمایہ داروں سے کوئی نہ کوئی خاص تعلق رکھتے ہیں اسی تعلق کے نتیجے میں ان ادیبوں کی تحریروں میں استعماری طاقتوں کے بیانیے، تاریخ، خیالات، نظریات اور تہذیب و ادب کے روشن پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ فینن کے خیال میں ان مقامی ادیبوں اور مفکرین نے بڑے عہدوں اور خطابات کے حصول کے لیے اپنے خاص تعلق کو نوآبادکاروں اور استعماری طاقتوں سے استوار کیے رکھا۔ برصغیر پاک و ہند کے نوآبادیاتی دور کے لکھے جانے والے ادبی سرمائے میں ایسی تحریریں مل جاتی ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف سامراجی حکمرانوں کی قربت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جو ادب تخلیق ہوا وہ جہاں مزاحمتی تھا وہاں ایسا ادب بھی تخلیق کیا گیا جس کا مقصد صرف اور صرف انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنا اور انگریزوں کی قربت تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو مقامی زبان سے متعارف کرانا بھی مقصود تھا۔ ان تحریروں میں نہ صرف انگریز کو ایک نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ اس کے مقابل مقامی

حریت پسندوں کو اوباشوں، لیٹروں، جور، ڈاکوؤں جیسے القابات سے نوازا گیا۔ اس وقت کے مقامی تخلیق کاروں اور شاعروں نے اپنی جان بچانے اور ذاتی مفادات لینے کی خاطر نئے حکمرانوں سے مفاہمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس نوآبادیاتی دور کی لکھی ہوئی تحریریں سنہرے دور کی ایک علامت کے طور پر ابھرتی ہیں۔ ان تحریروں میں نوآبادکار کی طاقت اور قوت کے رعب کو ایک مسیحائی کا انداز دیا گیا ہے۔ ایسا نجات دہندہ جسے قدرت نے تباہ حال قوم کی اصلاح اور خوش حالی کے لیے بہ طور تحفہ اور انعام بھیجا ہو۔ نوآبادیات کے عہد میں نوآبادکاروں کے بنائے ہوئے قوانین، اصلاحی ایجنڈے اور ادب پروری غرضیکہ ہر چیز کو صرف اور صرف ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنی تہذیب وثقافت، رسوم ورواج، علم وادب روایات واقدار اور سیاسی و سماجی شناخت کو نوآبادکاروں کے ہاں گروی رکھوا کر ہی کوئی قوم اپنی شناخت، قومیت اور آزادی کے مفہوم کی حقیقت سے واقف ہوتی ہے۔ فینن قومیت کا یہی شعور مقامی افراد میں نئے سرے سے پیدا کرنے کے بعد آزادی کی تحریک پر آمادہ کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

> ''عوام جو اپنے پیدائشی حقوق کھو چکتے ہیں، خودخانہ جنگی اور عداوتوں کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں رہنے کے عادی ہو چکتے ہیں۔ اب مختلف علاقوں میں قوم کے چہرے کو صاف اور شفاف کرنے کے لیے قیامت کی فضا میں آگے بڑھتے ہیں''۔ (۱۳)

درج بالا بیان نوآبادیوں کے مقامی باشندوں کی اس بے ساختگی کو ایک قوت سے تعبیر کرتا ہے۔ ان مقامی لوگوں کا یہی شعور ظالم وجابر سامراج کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی قوت فراہم کرتا ہے۔ آپس کے اختلافات کو بھلانے اور اتحاد پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ اتحاد اور اجتماعیت ہی سامراج سے آزادی حاصل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ برصغیر پاک وہند کے لحاظ سے میثاق لکھنؤ وہ وقت تھا جس نے ہندوستان کے لوگوں میں انگریز سامراج کے خلاف مشترکہ جدوجہد اور انگریز کے جاری کردہ ظلم وستم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس

مشترکہ جدوجہد کو حقیقی معنوں میں قومی شعور کی بیداری کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہوم رول، تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات تک مقامی آبادی جس انداز میں انگریز سامراجی قوت کے خلاف متحد ہوگئی تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب آزادی کی منزل زیادہ دور نہیں لیکن گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کا حامی ہونے اور سانحہ چوراچوری میں مقامی باشندوں کے ہاتھوں ایک تھانے پر دھاوا بولنے کے سبب تحریک ترک موالات کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا واضح رہے کہ چوراچوری کے سانحہ میں مقامی افراد کے ہاتھوں تھانے آگ لگا دی گئی تھی جس کے نتیجہ میں ۲۲ کے لگ بھگ سپاہی جل کر ہلاک ہو گئے تھے۔ گاندھی جی کی طرف سے تحریک ترموالات کے خاتمے کے بعد ایک مدت تک مسلمان اور ہندو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے نہ ہو سکے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کی منزل کوسوں دور چلی گئی۔

فینن کے ہاں نوآبادیاتی نظام میں نوآبادکاروں کے ظلم وتشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے متشدد مزاحمت اس وقت ناگزیر ہو جاتی ہے جب کوئی اور چارہ باقی نہ رہے۔ نوآبادکار ہمیشہ مختلف قوانین اور طاقت کے اندھا دھند استعمال سے جب مقامی آبادی تحقیر کا نشانہ بناتا ہے اور موقع بہ موقع عزت نفس کو مجروح کرتا ہے۔ اس عمل سے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مقامی آبادی کے افراد کی حیثیت کسی جانور کی سی ہے۔ نوآبادکاروں کی طرف سے وضع کردہ مخصوص اصطلاحیں جیسا کہ نیگرو (Negro) اور نیٹو (Native) ان کی مخصوص ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان اصطلاحوں کے ذریعے نوآبادکار مقامی افراد کے ذہنی اور جسمانی استحصال کا حق اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ مسلسل استحصال، ظلم وستم، بربریت اور جانوروں سے بھی بدتر سلوک برداشت کرنے کے بعد کسی بھی نوآبادی کے باشندوں کی طرف سے تہذیب وشائستگی اور امن وسلامتی کے لہجے کی امید رکھنا پرے کا خیال ہے۔ ظلم وستم بربریت اور استحصال کی اس صورت حال میں تحریک آزادی کی کاوش اور اس جدوجہد کے دوران کسی بھی گروہ سے بھڑ کنے والی تشدد کی کوئی ایک چنگاری پورے سماج کو آناً فاناً آگ کے جنگل میں بدل دیتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران واقع ہونے والے کئی

ایک واقعات اسی آگ کی چنگاری کا کام کر گئے جنھوں نے برصغیر پورے کو خاک وخون میں نہلا دیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برصغیر پاک وہند کی جملہ آبادی اور سیاسی وسماجی گروہ مشترکہ متشدد مزاحمت کی راہ اختیار کرتے تو تاریخ کی سمت کسی اور طرف ہوتی اور حالات یکسر مختلف ہوتے۔ فینن نوآبادیاتی نظام کو ایک قسم کا تشدد خیال کرتا ہے جیسا کہ مشہور کہاوت ہے "لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے" البتہ فینن کے ہاں ایسے نوآبادکاروں اور سامراجیت کے اداروں کے لیے لچک ملتی ہے جو نوآبادیاتی نظام میں بربریت، ظلم اور استحصالی ہتھ کنڈوں کا حصہ نہیں بنتے۔ فینن کے بقول:

> ''نوآبادکار ہمیشہ ایسا انسان نہیں ہوتا جسے قتل کر دینا چاہیے۔ استعماریوں کے انبوہ میں بہت سے ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو قوم کے بعض سپوتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر قومی جدوجہد کے قریب ہوتے ہیں''۔ (۱۴)

فینن نوآبادیاتی دور کی اقتصادی صورت حال کو پرکھنے کے لیے مقامی آبادی اور حکمرانوں کے متوسط طبقے کے افراد کی ذہنی حالت کا موازنہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق مقامی افراد کا متوسط طبقہ نوآبادکاروں کے متوسط طبقہ سے منسلک ہونے کو لازمی خیال کرتا ہے تاکہ نوآبادکاروں کے استعماری نظام کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا جا سکے یہی وہ طبقہ ہے جو اپنے مالیاتی مفادات کو برقرار رکھنے کے لیے نوآبادکاروں کے جاری کردہ استحصالی بیانیے کو جاری رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ فینن کے مطابق مقامی آبادی کے وہ افراد جو قومیت پر پکے ہوتے ہیں بعض اوقات وہ بھی سامراجیت کے بنائے ہوئے راستوں پر چل نکلتے ہیں اور نوآبادیاتی عہد کے خاتمے کے بعد بھی تسلیم شدہ حکومت میں بھی اسی کٹر قومیت کا متوسط طبقہ اپنی اجارہ داری پھیلانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتا رہا ہے۔ مزاحمت اور نوآبادیت کی مخالفت کے مختلف مدارج میں اس نکتہ کو نشان زد کیا جا سکتا ہے کہ مقامی آبادی کے متوسط طبقہ کی ذہنیت اور نفسیات پر عموماً سامراج اور استعماریت کے متوسط طبقہ کے اثرات کی واضح چھاپ موجود ہوتی ہے۔ اس متوسط طبقہ کے علاوہ وہ سیاسی

جماعتیں اوران کے لیڈران کا کردار بھی قابل ذکر ہے جو آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی بھی ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں۔فینن ایسے کرداروں کونشان زد کرتا ہےاور مشورہ دیتا ہے کہ نئی قومی حکومت کے قائم ہوتے ہی ان سیاسی جماعتوں کے ان لیڈران کو ردِ استعماریت کے ایسے بیانیے وضع کرنے چاہیں جونو آبادیاتی دور کے استحصال کے اثرات کوزائل کرنے میں مددگار ہوں۔قومی تہذیب اور ثقافت،علمی وادبی فکر کا فروغ ہی نئی آزاد ہونے والی ریاست کے افراد کوان کی پرانی تہذیب وثقافت،علمی وادبی، سیاسی اور سماجی، معاشرتی ومعاشی اور اقتصادی روایات سے منسلک ہونے اور قدیم قومی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے میں اپنا کردار ادا کرسکتی ہےاورنو آبادکاروں کے مسخ کردہ حقائق اور شناخت کوازسرنو قائم کرنے کی کوشش کرسکتی ہے،فینن کے اپنے الفاظ کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

> ''استعماریت محض مقبوضہ ملک کے حال اور مستقبل پر تسلط جمانے پر ہی قناعت نہیں کرتی، استعماریت صرف عوام کو اپنی گرفت میں لے کر اور مقامی باشندوں کے ذہن کوصورت اور معنی سے خالی کر کے ہی مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ ایک طرح کی غیر صحت مندانہ منطق سے کام لیتے ہوئے یہ مظلوم عوام کے پیچھے پڑ جاتی ہےاوراسے مسخ کر کے بدہیئت اور تباہ کر دیتی ہے''۔(۱۵)

فینن استعماریت اورنو آبادیاتی نظامی کی تہذیب وثقافت کے منفی پہلوؤں سے بچنے کے لیےقومی تہذیب اوراپنی اصل ثقافتی جڑوں کومضبوطی سے تھامے رکھنے پرزور دیتا ہے۔اس کے مطابق نو آبادیاتی دور میں مقامی ادیب ودانش ور بیک وقت دو تہذیبوں کے ہونے کی وجہ سے دوغلا پن کا شکار ہو جاتا ہےاوراسی دوغلے پن کے سبب ہمہ وقت دو شناختوں میں الجھ جاتا ہے۔ اردوادب میں بہت سارے تخلیق کاراس الجھن میں گھرے نظر آتے ہیں اس الجھن کے سبب ادبی متون کافی پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔اس صورت حال میں ادیب اوردانش وروں کی تخلیقی صلاحیتیں

فطری اظہار سے معدوم ہو جاتی ہیں لیکن یہ کالی رات سدا نہیں رہتی بالآخر یہ بادل چھٹ جاتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ مزاحمتی اور رد استعماری رویے پروان چڑھتے ہیں تو ادیب اور تخلیق کار اپنی حقیقی اور فطری شناخت کا تعین کرنے اور واضح کرنے میں بالآخر کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ مزاحمتی رویے اور مزاحمتی بیانیے استعماریت اور سامراجیت کی اثر سے آزاد کرانے کے بعد کسی بھی مقامی آبادی کو اس کی اصل تہذیبی شناخت سے منسلک کرتے ہیں جو ان کی ذات اور مقام و مرتبے کا اصل اظہار کرتی ہے۔ فینن نو آبادیاتی دور میں لکھی جانے والی ادبی تحریروں کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ ابتدائی دور کی ادبی تخلیقات جو نو آبادکاروں کی لائی ہوئی تہذیب و ثقافت کی مخالفت کی بجائے نو آبادیاتی تہذیب کو غیر مشروط انداز میں اپنے اندر جذب کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ نو آبادکاروں کے قریب ہونے کے لیے مقامی ادیب اور دانش ور نو آبادکاروں کے ادب سے براہ راست اثرات کو جذب کر کے انھی کے رنگ میں ڈھلنے کی کوشش کرتے رہے اور انھی کی طرز پہ ادب تخلیق کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس ضمن میں ہندوستان میں انجمن پنجاب کا قیام اور اس پلیٹ فارم سے پیش کردہ نظمیہ شاعری کو جدید اردو نظم کے طور پر پیش کرنا عمدہ ترین مثال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی نظموں کے تراجم اور مقامی شاعری کو مغربی شاعری کے معیار پر پرکھنا، خود کی شاعری کو ناقص اور انگریزی شعرا کی شاعری کو برتر خیال کرنا بھی اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں جن کا اثر آج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ نو آبادیاتی دور کے دوسرے دور میں ادیب اور دانش ور اپنی کھوئی ہوئی ساخت، شناخت اور گم شدہ حصوں کی دریافت اور دوبارہ بحالی کی کوشش کرتا ہے۔ ماضی کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے اور ماضی میں خود کو لے کر جا کر خود کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اس وقت احساس ہوتا ہے کہ غلامی واقعی ذلت اور پستی کا نام ہے وہ لمحے کسی نعمت سے کم نہ تھے جب استعماریت کا نام و نشاں تک نہ تھا۔ فینن کی تحریر کے مفہوم کی روشنی میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ:

''بچپن کے گزرے ہوئے واقعات اس کی یادوں کی گہرائیوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ مستعار جمالیات اور دیگر آسمانوں کے نیچے دریافت شدہ نظریاتِ زندگی کی روشنی میں پرانے قصے کہانیوں کی نئی تعبیریں ہونے لگتی ہیں''۔(۱۶)

اس بیان کی روشنی میں بیسویں صدی کی ابتدائی قومی اور ملی نظم کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔اس پوری نظمیہ شاعری میں ماضی کا شکوہ اپنی جھلک پیش کرتا نظر آتا ہے۔اس نظم میں طنز ومزاح، تمثیلی عناصر ادب میں مایوسی اور شکست جیسے تجربات کا ردعمل قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں نوآبادیاتی دور کے اس دوسرے ادبی عہد میں تمثیل نگاری کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح کے میدان میں اردو نظم کے علاوہ جس صنف نے اپنے حصہ ڈالا ان میں پنچ اخبار سرفہرست ہیں۔ خاص کر اودھ پنچ اخبار اس میں طنز ومزاح اور تمثیلی قصوں کو پروان چڑھانے میں نوآبادیاتی نظام کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور جاری کردہ تعزیروں اور قوانین نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ البتہ مقامی نظم گو شعرا میں اکبر الہ آبادی کی شاعری طنز اور مزاح کے پیرائے میں سامراجیت اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف علم بلند کرنے والے لوگوں میں صف اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ مزاحمتی بیانیے اور رد استعماریت کے زمرے میں نوآبادیاتی دور کا تیسرا اور آخری دور حقیقی طور پر ہی انقلاب اور بیداری کا دور تھا۔اس دور میں حقیقی جنگجو، انقلاب اور قومی وملی ادب تخلیق ہوتا ہے۔فنون لطیفہ جیسا کہ مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ کے تمام فنون کے علاوہ شاعری کی جملہ اقسام جو نوآبادیاتی عہد کے ظلم وستم، استحصال اور جبر کے سبب اپنا اصل رنگ ڈھنگ کھو چکی ہوتی ہیں۔اس آخری دور میں سبھی دوبارہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آتے ہیں اور تہذیب وثقافت کے قدیم رنگ بکھیرنا شروع کردیتے ہیں اور چلتے چلتے اپنی قدیم روایت سے جڑ جاتے ہیں۔اس دور میں پیدا ہونے والا ادبی ذوق داخلی جبر اور خارجی انتخاب کا مجسم ہوتا ہے۔اس ذوق کے سبب تخلیقیت نئے رنگ اور آہنگ سے مزین ہوکر نمودار ہوتی ہے۔وہ شعرا جو ابتدا میں نوآبادیاتی رعب

اور دبدبے اور نوآبادیاتی بیانیے سے مرعوب ومتاثر ہو کر نوآبادکاروں کے گن گاتے نظر آتے تھے، یکسر بدل جاتے ہیں اور اپنی شاعری عوامی مسائل کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ موضوعات بدل جاتے ہیں۔ عوامی مسائل کا چرچا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس دور کے مقامی ادبا وشعرا مقامی تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار کو ان کے ماضی کے جھروکوں سے نکال کر جدیدیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ فینن کے مطابق یہ دور نئی امنگوں اور امیدوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ ادیب کو مشورہ دیتا ہے کہ اس دور کے ادیب کو چاہیے کہ وہ ماضی کو مدنظر رکھتے ہوئے مستقبل کی پیش گوئی کرے اور مستقبل کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کرے، قوم کو ماضی کے اندھیروں میں دھکیلنے کی بجائے امید و یاس اور رجائیت کا راستہ دکھائے تاکہ مقامی آبادی خود کے قدموں پر کھڑا ہو سکے اور غلامی کا جو طوق انھوں نے گلے کا ہار بنا کر پہن رکھا ہے اس کو اتار پرے کریں اس حوالہ سے ہندوستان میں بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں لکھی جانے والی اردو نظم اس تیسرے عہد کی عکاس ہے۔ اس تیسرے اور آخری عہد کے نظم گو شعرا کی نظمیں جہاں اپنے ماضی اور مقامی ہیروز کی یادوں میں اپنائیت کا احساس دیتی ہے وہیں مزاحمت اور مزاحمتی بیانیوں کا تاثر دیتی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے منظوم ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے نوآباد کاروں اور نوآبادیاتی نظام کے اصول وقوانین، جبر، استحصال اور عفریت کے مخالف لہجہ سخت بہ آسانی سمجھ آتا ہے۔

نوآبادیاتی صورت حال جو کسی آبادی کی انفرادی شناخت اور قومی تہذیب وثقافت کو ذہنی وجسمانی سطح پر کچلنے کے بعد اپنی شناخت اور تہذیب وثقافت کا ملمع کرتی ہے۔ فینن اس ملمع کاری اور اس کے اثرات سے نجات کے لیے مقامی آبادی کی طرف سے مسلسل جدوجہد اور سیاسی وسماجی، معاشی ومعاشرتی، اور علمی وادبی میدانوں میں قومی وملی تہذیب وثقافت اور روایات واقدار کے شعور کو اجاگر کرنے پر بھرپور زور دیتا ہے۔ اس کی فکر نوآبادکاروں کے وضع کردہ ان تمام سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی وادبی اور معاشرتی بیانیوں کی چھان بین کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ واضح رہے کہ

نو آبادکار کی طرف سے ایسے بیانیوں کا مقصد صرف اور صرف مقامی سطح پر آبادی کے افراد میں شناخت کے حوالہ سے احساس کم تری پیدا کرنا اور اس احساس کے سبب اپنے اقتدار کو عروج دینا اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔فینن نے مغربی نو آبادکاروں کے انھی منافقانہ رویوں اور معاشی وسائل پر اپنی اجادہ داری کی تدبیروں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔مزید یہ کہ انھوں نے اپنی اس فکر سے محکوم قوموں کو اپنی تہذیبی وثقافتی جڑوں کی تلاش اور دریافت پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔فینن کے ہاں موجود اس نو آبادیاتی نظام کو اس کے معروضی سیاق وسباق میں دیکھتے ہوئے مزاحمت اور مزاحمتی بیانیوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔اردو زبان وادب میں پس نو آبادیاتی مطالعہ کرتے ہوئے فینن کی فکر اور نظریاتی پختگی کو مدنظر رکھنا فکر وفن کے حوالہ سے نئے زاویے اور نئی راہیں دکھا سکتی ہے۔

تاریخ عالم پر نظر دوڑائیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ نو آبادیاتی نظام کا باقاعدہ آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر نشاۃ ثانیہ کی لہر سے ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ کولمبس جس نے ہندوستان کا راستہ تلاش کرنے کے لیے ۱۴۹۲ء میں اپنے سفر کا آغاز جزائر کنیری سے کیا۔اسے ایک طویل اور حوصلہ شکن سمندری سفر درپیش تھا جس کا اور تھانہ چھوڑ،لیکن نشاۃِ ثانیہ کے عطا کردہ عزم کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ایک دن جہاز ران بالکل مایوس ہو کر بغاوت کی سوچ رہے تھے کہ دور مغرب میں نیلے آسمان پر آبی پرندے اڑتے نظر آئے۔مایوسی،امید اور مسرت کی لہر میں تبدیل ہو گئی۔سرسبز وشاداب "بہاما" جزائر کا سلسلہ اب ان کے سامنے تھا۔امریکہ کی دریافت نے ایک نئی نویلی سرزمین کا دروازہ یورپی اقوام پر کھول دیا۔ایک براعظم شمال میں تھا تو دوسرا جنوب میں۔ان براعظموں کے درمیان میں لاتعداد جزائر جو "باغِ عدن" کا نمونہ پیش کر رہے تھے،معدنی ذرائع سے مالا مال۔اگر شمال میں قطب شمالی کے برف زار تھے تو جنوب کے علاقے قطب جنوبی سے ملتے تھے۔یورپی اقوام کی قسمت ہی بدل گئی تھی۔ان کو سیم وزر اور مال و دولت سے لبریز خزانوں کا راستہ مل گیا تھا گویا Treasure Island تھا جس کا نقشہ ان کے

ہاتھ آ گیا تھا۔ رابرٹ لوئس سن کے ناول "ٹریژر آئی لینڈ" کو اس دلچسپ صورتِ حال کا بلیغ استعارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قبضہ میں مفتوحہ سرزمین پر جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کی جزائر "بہاما" کے بہت سے سرخ فام امریکی قبائل " کولمبس " کے دورِ اقتدار میں ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ کولمبس نے صرف "امریکہ " کو ہی نہیں دریافت کیا تھا بل کہ یورپ کے لیے سونے کے شہروں کا راستہ بھی کھول دیا تھا۔ نئے براعظموں کی دریافت سے جہاں سائنسی علوم کو پروان چڑھانے کے لیے زبردست مواقع میسر آئے وہاں نوآبادیاتی نظام اور مسیحی مشنریوں نے آکاس بیل کی طرح پوری دنیا کو گرفت میں لے لیا۔ تمام محکوم اقوام کے قدرتی وسائل یورپی شہروں میں کھنچتے چلے گئے۔ ہندوستان جو کہ ہزار ہا سال سے خوش حال ملک تھا کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے لوٹ لوٹ کر کنگال کر دیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں کبھی قحط نہیں پڑا تھا وہاں بھی لوگوں کو افلاس وادبار نے آلیا۔ استعماری نظام کا میکانزم بلاشبہ استحصال پر قائم ہوتا ہے۔

نوآبادیاتی نظام کو دنیا پر غلبہ پانے میں دو نفسیاتی محرکات کا بنیادی کردار رہا ہے۔ پہلا محرک یورپی اقوام کا مذہبی تفاخر تھا۔ ان کا ہمیشہ سے یہ اصرار رہا ہے کہ عیسائیت دنیا کا اعلیٰ ترین مذہب ہے اس کے علاوہ نجات کے سارے راستے گمراہ کن اور باطل کی پیداوار ہیں۔ دوسرا محرک دینا کی برتر نسل ہونے کا شدید احساس قرار دیا گیا ہے۔ یورپی اقوام کو پختہ یقین تھا کہ باقی تمام اقوام انسانی ارتقا کے حوالے سے یورپی اقوام کے مقابلے میں دوسرے درجے کی مخلوق ہیں مزید یہ کہ کم عقل اور بدحال۔ چناں چہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں نیلی اور رنگ سفید تھا، خود کو Super Man تصور کرتا تھا۔ ستاروں سے اتری ہوئی کوئی اعلیٰ مخلوق جس کے کندھوں پر خدا اور فطرت کی جانب سے یہ ذمہ داری ڈال دی گئی تھی کہ دنیا بھر کے کم تر انسانوں کو تہذیب سکھائے۔ اسی طرح بگاڑ کی ایک صورت اور بھی سامنے آئی وہ یہ کہ فلسفے کی تعلیم نے نیکی اور خیر کو انسانی عمل کا قانونِ مطلق قرار دیا۔ " کانٹ" نے اس قانون کو کچھ اور معنوں میں استعمال کیا تھا لیکن یورپی اقوام نے

اسے مطلق قانون کی حیثیت میں استعماریت کا جواز قرار دے دیا۔نوآبادیات کا فلسفیانہ جواز یہ فراہم کیا گیا کہ نوآبادیت دنیا کو خیر وفلاح اور روشنی کی طرف بلانے کے لیے قائم کی جارہی ہیں۔ اصل مقصد پس ماندہ اقوام کو یسوع مسیح کے سایہ رحمت میں لانا ہے۔یوں نوآبادیاتی جنون کا دوسرا رخ مذہبی جنون کی صورت میں سامنے آیا۔ بین الاقوامی سطح پر استعماریت کے جنون کو ہتھیار کے طور پر خوب استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں مشنری ادارے ایسٹ انڈیا کمپنی کی معیت میں وارد ہوئے نوآبادیاتی عہد کی ساری جدوجہد کی بنیاد ڈارون کا دیا ہوا "بقائے اصلح" کا قانون تھا جسے مذہبی تکبر، نسلی تفاخر اور سائنسی علمیت کے منفی تصور پر استوار کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی تک یورپی نوآبادیات ظلم وستم کی منڈیاں بن گئیں۔اس دوران تیسری دنیا میں فکری اور روحانی غلام کاری کا شرمناک کاروبار اپنے عروج پر تھا۔ازمنہ وسطیٰ سے یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی مقصدیت کی پیروی کرتے ہیں۔دونوں کا مقصود انسانیت کی فلاح ہے۔یہ دعویٰ خاص طور پر کیا گیا کہ سائنس اپنے دائرہ کار میں انسانی ترقی اور فلاح کا دوسرا نام ہے۔یہ دونوں انسان کی منطقی اور اخلاقی ضرورت ہیں اور اخلاقی ذمہ داری بھی۔ اسی بنا پر نوآبادیاتی نظام کے ان دونوں مثبت مقتضیات کی آڑ میں یورپی اقوام نے انسانیت کو عقب میں دھکیل کر مطلب براری اور موقع پرستی کو فوقیت دی۔یہ طے ہوا کہ جو سفید فام نہیں وہ ازل سے نیچ اور رذیل ہے، جو مسیحیت کو تسلیم نہیں کرتا وہ دوزخی، لعنتی اور گردن زدنی ہے۔اسی طرح شیطان صفت پادریوں اور فرعون صفت یورپی حکمرانوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔مسیحیت کو دنیا بھر میں پس ماندہ اقوام میں فروغ دیا تاکہ استعماریت کے ایجنڈے کو فروغ دیا جاسکے۔ انسانیت کی تذلیل جس شرمناک طریقے سے کی گئی اس کی ہولناک تصویر انگریزی ناول The weeping woods میں بڑی چابک دستی سے کی گئی ہے۔افسوس نشاۃِ ثانیہ سے شروع ہونے والا روشن خیالی کا یہ ایجنڈا نوآبادیاتی بہمیت اور معاشی ومعاشرتی، نفسیاتی، اقتصادی اور نسلی استحصال پر اختتام پذیر ہوا۔

نو آبادیات کو مابدل جدید فکری جہات کا ایک امتیازی جزو خیال کیا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو مابعد نو آبادیت کی اصطلاح بھی نو آبادیاتی فکر کا معروضی انداز کا تجزیہ کرتی ہے اور اس تجزیہ سے حاصل ہونے والے نتائج اور حاصلات کی ترتیب و تعیین کے متعلق سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ مابعد نو آبادیت کا مطالعہ نو آبادکار اور نو آبادیاتی باشندوں کے باہمی میل جول اور استحصالی صورت حال میں مقتدر اور ماتحت کلامیوں کی فکری آویزش کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کا نام ہے۔ معاصر عہد میں نو آبادیاتی حربوں اور استحصالی ہتھ کنڈوں کے جدید نظام پر غور و فکر بھی مابعد نو آبادیتی مطالعہ کا حصہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند براہِ راست غلامی کی صورتِ حال سے گزر چکا ہے اور اردو زبان کا وجود اسی کے دم سے ہے۔ اس لیے اردو کے شعر و ادب میں خاص اردو نظم میں مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

نو آبادیاتی نظام کے ظلم و ستم اور استحصال سے تنگ عوام و محکوم طبقہ نے اپنے نظریات، معاشرے اور ثقافت کو بچانے کے لیے ہمیشہ ردعمل کی تحاریک اور مزاحمت کا سہارا لیا ہے اور ان کے اثر سے آزادی کی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ جہاں یورپی اقوام ترقی اور بیداری، روشن خیالی اور سائنس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہوئیں وہاں انسانوں کو ذہنی غلامی و پستی اور جبر و استحصال کے نظام سے بھی متعارف کرا گئیں۔ انسانوں کو طبقات میں تقسیم کرنے کے بعد اجارہ داری کرنے کا ڈھنگ اور اسلوب بھی دنیا کو دیتے ہوئے دنیا کو پہلی، دوسری اور تیسری دنیا میں منقسم بھی کر گئیں۔ اس جبر اور استحصال کے خلاف پوری دنیا کے ادبا، محققین، نقاد اپنی رائے دینے پر مجبور ہو گئے۔ پندرھویں صدی سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آج اکیسویں صدی میں فلسطین، عراق، کشمیر، افغانستان اور شام تک کے علاقوں کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہے۔ تاریکی، جبر، ناامیدی اور ظلم و ستم کے اس دور میں عوام کے دلوں میں روشنی اور جدوجہد کی شمع روشن رکھنے کے لیے ادیب اور شاعر اپنے حصہ کا کام کرنے میں آج بھی مصروف ہیں جیسا ماضی کے ادبا اور شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو مزاحمت اور ردعمل کے طور پر جب بھی تخلیق ہوا

اس کے خالق کو ہمیشہ بھگتنا پڑا۔گارشیا لوکا، ڈیوڈ گیٹ، بنجمن مولوٹس،فرخی یزدی، محمد رضا عشقی،سارتر،محمود درویش، آندرے مالرو، ناظم حکمت، رومین رولاں، کریم پور شیرازی، مرتضٰی کیوان، حمد بہرنگی، جلال الاحمد، احمد شاملو،علی شریعتی اور پروین اعتصامی کے ساتھ ساتھ لوشون، اے چھینگ، ماؤدون، لاؤشے، چولی بو، ابراہیم طوقان، رشید سلیم الخوری، محمد علی الحومانی، سمیع القاسم، سلمٰی الخضر ،کمال ناصر، جبراابراہیم جبرا،توفیق صائغ،لیلیٰ خالد، بورس پاسترناک،اناخموتوا، یوتے شنکو اور واز نیکی کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں " اکبرالہ آبادی، اقبال، فیض احمد فیض، حسرت، ساحرلدھیانوی،علی سردارجعفری، حبیب جالب، مجید امجد،شکیب جلالی،ظہیر کاشمیری، احمد مشتاق، جاوید انور،عبدالعزیز خالد،ابن انشا،یحیٰی امجد،کشور ناہید،مولانا ظفرعلی خان،احمد ندیم قاسمی، یوسف ظفر،رئیس امروہی،شورش کاشمیری،ضمیر جعفری،احمد فراز، خاطر غزنوی،شہزاداحمد،نعیم صدیقی،طفیل ہوشیار پوری، امجد اسلام امجد اور افتخار عارف جیسے بیسیوں شعرا اور ادبا ہیں جنھوں نے نوآبادیاتی نظام کے پیش کردہ جبر واستحصال کے نظام کے خلاف مزاحمتی اور ردعمل کا ادب تخلیق کیا اور اپنی تخلیقات کے سبب معاشرے میں انقلاب، آزادی فکر اور حریت کے لیے آواز اٹھائی۔ چاہے جتنے بھی انقلاب آئے، صنعتی انقلاب، انقلاب روس، سپین، انقلاب ایران، انقلاب چین یا انقلاب فرانس وغیرہ نے ادب کو خاص شاعری کو ضرور متاثر کیا اور صنف شاعری میں نظم نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا چاہے وہ کسی بھی زبان کا حصہ بنی۔ان انقلابات اور تحاریک آزادی نے اردو شاعری پر حد درجہ اثر ڈالا جو مختلف شعرا کے ہاں موجود ہے۔ اردو کے نظم گو شعرا اس حوالے سے نمایاں ہیں جن کا ذکر او پر گزر چکا،اسی اثر کو نمایاں طور پر سمجھنے کے لیے ان نظریات کی روشنی میں اردو نظم کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہاں تحریک آزادی کشمیر سے منسلک شعرا کا تذکرہ از حد ضروری ہے جنھوں نے مسئلہ کشمیر کو دنیا میں اجاگر کرنے کے لیے اپنی شاعری کا سہارا لیا،ان میں محمد دین فوق، ملا طاہر غنی حبہ خاتون،عبدالاحد آزاد اور غلام احمد مہجور نمایاں طور پر تحریک آزادی کے سرخیل ہیں۔

نوآبادیاتی نظام کے پروردہ استحصالی نظام کے خلاف مزاحمت اور ردعمل کا جو بھی ادب

ان شعرا کے ہاں ہے چاہے وہ اپنی زباں میں ہے یا تراجم کی صورت میں، پس نوآبادیاتی اثرات کو واضح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ابھی تک دنیا اسی نظام کے تابع زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے تسلط کے ناقدین میں جن محققین اور نقادوں نے اپنی اپنی تصانیف دنیا کے سامنے پیش کیں اور نوآبادیاتی نظام اور اس کے موجودہ دور تک کے اثرات کا اظہار کیا ان میں سموئیل ہنٹنگٹن پی، فرانز زفینن، ایڈورڈ سعید، ہومی کے بھابھا، شمیم حنفی اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناقدین نے اپنی تنقید کے سبب نوآبادیاتی نظام خاص یورپی سامراجی نظام کا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس نظام کے تحت تخلیق پانے والے ادب اور شناختی بحران کو بھی ایک الگ انداز میں سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی کہ اردو زبان و ادب 'جو اسی نوآبادیاتی نظام کا ساختہ ہے' پر اس نظام کے اثرات کو سمجھا جائے اور تحقیقی و تنقیدی سانچے سے گزار کر حقیقت کا ادراک کیا جائے تاکہ شناخت اور شناختی بحران کا ازالہ ہو سکے اور انسانیت اپنی شناخت قائم کر کے اس استحصالی نظام سے چھٹکارا پا سکے۔ اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم کردار ادب کا ہے اور ادب میں شاعری خاص نظم ہمیشہ نمایاں رہے ہیں اور ہوں گے۔

اس ساری صورتِ حال کو پیدا کرنے کے لیے جو تاثر بنیادی حیثیت رکھتا ہے وہ یہ کہ نوآبادیاتی نظام مقامی لوگوں کی پس ماندگی دور کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی تاثر نوآبادکار کے مقتدر کلامیے کی بنیاد ہے۔ اسی کلامیے کے سبب مفتوح قوم کا زاویہ فکر تبدیل کیا جاتا ہے اور اس کی جادوئی تاثیر کے سبب قابض لوگ خود کو برتر اور مغلوب قوم کی اقدار اور روایات کو کم تر اور حقیر گردانے لگتے ہیں۔ برطانوی نوآبادیات کی تاریخ بھی اسی مقتدر بیانیے کی مثال واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی بیانیے کو بنیاد بنا کر برطانیہ نے جدید نظامِ خیال کی تشکیل کی اور بتدریج دنیا کے مختلف ممالک کے تجارتی امور اور معیشت پر قبضہ کیا اور مقامی آبادی کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترویج کا جھانسہ دے کر محض مقامی روایات کے حصار میں قید رکھا۔ اس کے برعکس مقامی افراد نے جب مقتدر بیانیے کے ردعمل میں اپنے فکر و عمل کو جدید خطوط پر استوار کیا تو نظریاتی

سطح پر قومیت پرستی، مزاحمت، احتجاج، تہذیبی آویزش و آمیزش اور منقسم شعور جیسے رجحانات سامنے آئے۔ یہ رجحانات اردو ادب کی من جملہ اصناف میں سے خاص صنفِ شاعری ''اردو نظم'' میں وسیع پیمانے پر تخلیقی سرمائے کا حصہ ہیں اور یہی پس نوآبادیات اثر ہے۔ اردو زبان و ادب کی تنقید کی تفہیم اور فروغ میں گوپی چند نارنگ، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین، وہاب اشرفی، شافع قدوائی، ڈاکٹر وزیر آغا، قمر جمیل، فہیم اعظمی، ضمیر بدایونی، اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے نام قابل تحسین اور قابل داد ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ مبارک علی، ''تاریخ اور ریاست''، مضمون: امپیریئل ازم کیا ہے، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۵۷

2.www.goggle.com/UrduEnglishDictionary/Colonialism.

3.Same

۴۔ فیروز اللغات، اردو، جامع، ایڈیشن ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۴۹

۵۔ ایضاً

۶۔ نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر، "نوآبادیاتی صورت حال"، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن، لاہور، کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹیئل کالج، ص ۶۴ تا ۶۵

7. Walter Laquer, "A dictionary of Politics" weiden field and Nicolson, London, P105.

۸۔ فرہنگ اصطلاحات، جلد اول (اے تا ڈی) لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۴ء

۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، "برطانوی ہندوستان"، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰ تا ۱۱

10. Young, J.C : Post - Colonialism, A very short introduction , p.129

11. Francis Maspero, Toward the African revolution, (Frantz Fanon) , New York, Grove Press, 1994, P.7

۱۲۔فینن فرانز"افتادگان خاک" مترجم: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، لاہور، نگارشات، مارچ ۱۹۴۹ء،ص۵۰

۱۳۔ایضاً،ص۶

۱۴۔ایضاً،ص۱۰۵

۱۵۔ایضاً،ص۲۰

۱۶۔ایضاً،ص۱۸۵